عروج وزوال کے الٰہی قوانین

از

(جناب مولوی محمد تقی صاحب امینی)

(۳)

اصلح قوم کے معاشرہ کا نشوو ارتقا ہوتا رہنا ضروری ہے

یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن حکیم نے "اصلح"[1] کے لئے جو معیار قائم کیا ہے اور جو حدود و نقوش متعین کئے ہیں وہ سب حقیقی و دائمی قیام و بقار کے لئے ہیں یعنی دنیا کی جو قوم ٹھیک ٹھیک اپنے آپ کو اس معیار کے مطابق بنالے گی اُسے کبھی زوال نہ ہوگا۔ اور جس قدر اس سے دور ہوتی جائے گی اسی مناسبت سے اس کا زوال ہوتا جائےگا۔

---

[1] جدید دنیا نے بھی "بقار اصلح" کا نظریہ پیش کیا ہے۔ یوں تو اس کا ثبوت قدیم مذاہب اور قدیم نظریات میں بھی ملتا ہے لیکن چونکہ "ڈارون" نے نہایت واضح دلائل پیش کر کے اس کو تمام علمی شعبوں پر حاوی بنا دیا ہے اس لئے اس زمانہ میں انھیں کے نام کے ساتھ اس کی شہرت ہوگئی ہے۔

یہ مسئلہ آج علمی دنیا کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے اور علوم و فنون کا کوئی شعبہ ایسا باقی نہیں بچا ہے جو اس سے متاثر نہ ہوا ہو۔ ڈارون نے اس کو جس حیثیت اور جس نوعیت سے پیش کیا ہے وہ میرے موضوع بحث سے خارج ہے البتہ اس سلسلہ کی یہاں چند چیزیں ذکر کردینی ضروری ہیں تاکہ قومی اور جماعتی زندگی پر اس کا جو اثر پڑتا ہے اس کی وضاحت ہو سکے۔

"اخلاقیات" کے مصنف پروفیسر جان ڈیوی اور پروفیسر جیمس ایچ ٹفٹس کہتے ہیں۔

"ڈارون" کے نزدیک "بقار اصلح" کے معنی یہ ہیں کہ کل جاندار، نباتات، حیوانات اور انسان سب کے سب دراصل زندگی کی کم ترقی یافتہ شکلوں سے عالم وجود میں آتے ہیں اور انواع میں باہمی امتیاز دراصل اُن انواع کی بقار سے ہوتا ہے جن کے اعضاد قویٰ اس ماحول کے مناسب ہوتے ہیں جس ماحول میں یہ واقع ہوگئے ہیں۔ اس طریق سے "بقار اصلح" ایک ایسی تدبیر ہے جس کے ذریعہ سے ارتقا ہوتا ہے۔ ڈارون اس امر کو "کشمکش حیات" کہتا ہے۔

ہر فرد کشمکش حیات یا تنازع للبقار میں مصروف ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کشمکش میں جن کو مدافعت کے مناسب آلات میسر آتے ہیں وہ باقی رہتے ہیں اور جو غیر موزوں اور ناقابل ہوتے ہیں وہ صفحۂ ہستی سے محو ہو جاتے ہیں۔

کیوں کہ قرآنی صلاحیت دراصل "افادیت" کے پیمانہ سے ناپی جاتی ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ صلاحیت کے مفہوم کو اخلاقیت یا مادیت کے کسی ایک گوشہ تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ ایک طرف اخلاقیت کی اعلیٰ پیمانہ پر تنظیم ہو اور دوسری طرف مادیت کا ارتقار ہوتا رہے۔ اگر دونوں میں کسی ایک سے غفلت برتی گئی تو اس کا خمیازہ زوال اور خسران کی شکل میں قومی زندگی کو بھگتنا لازمی ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس کو ڈارون "انتخاب فطرت" کہتا ہے (اخلاقیات باث صنہ ۲۲)

اس موقع پر تین اصطلاحیں ذکر کی گئی ہیں۔ (۱) تنازع للبقار یعنی زندہ اور باقی رہنے کے لئے باہمی کشمکش۔ (۲) انتخاب طبعی یا فطری یعنی جو چیزیں باقی رہنے کے لائق ہیں فطری اور طبعی طور پر قیام و بقار کے لئے انھیں کا انتخاب۔ (۳) بقار اصلح یعنی وہی چیزیں باقی رہتی ہیں جن میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے

اسی سلسلہ کی ایک اور اصطلاح "قانون وراثت" ہے یعنی نسلی اوصاف وراثت کے طور پر منتقل ہوتے رہتے ہیں غرض انھیں چاروں پر اس مسئلہ کی بنیاد ہے۔

"بقار اصلح" کی مذکورہ توجیہ کی بنا پر انسان اور حیوان ایک ہی نسل سے قرار پاتے ہیں یعنی حیوان کی تدریجی ارتقار کی شکل انسان ہے اور گوریلا بندر انسان بننے کا ابتدائی نقشہ ہے۔

جب انسان کی اصلیت حیوان تسلیم کر لی گئی تو لازمی طور سے اس کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک ایسی زاویۂ نگاہ درکار ہوگی جس میں حیوانیت کے خد وخال ابھرے ہوئے ہوں۔ چنانچہ اس نظریہ کی بنیاد پر جن قوموں کے تمدن کی بنیاد رکھی گئی ہے ان کے یہاں گھریلو زندگی سے لے کر قومی اور بین الاقوامی معاملات کے حل کرنے تک یہی زاویۂ نگاہ کارفرما ہے۔ اسی بنار پر وہاں اخلاقیات سے بہت حد تک بے اعتنائی برتتے ہوئے مادیات کی فراہمی پر اتنا زیادہ زور صرف کیا جاتا ہے کہ جیسے دیکھنے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ دراصل "بقار نوع" کا راز اسی میں پوشیدہ ہے اور وہی قوم "اصلح" ہو سکتی ہے جس کے پاس مادی طاقت کے زیادہ سے زیادہ انبار ہوں۔

اس غلط اندیشی کی بنیاد قوانین عروج وزوال کا تحقیقی و تنقیدی نظر سے مطالعہ نہیں ہے بلکہ ماہیت انسانی کی غلط ترجمانی ہے جیسا کہ اس کی وضاحت اگلے صفحات میں ہوگی پھر یہی مصنفین آگے چل کر کہتے ہیں

"ڈارون" کو زیادہ تر انواع کے طبعی ارتقار سے دلچسپی تھی اس نے اخلاقی حیثیتوں کو بھی اسی طرح سے توجیہ کرنے کے امکان کی طرف توجہ دلائی ہے مگر اس موضوع پر تفصیلی بحث "ہربرٹ اسپنسر" نے کی ہے اور اس نے تصور ارتقار کو ڈارون سے بالکل علیحدہ معنوں میں لیا ہے اور اس کو اخلاقیات ہی پر نہیں بلکہ کل انسانی معاہدو رواجات پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے ۔۔۔۔۔۔ اسپنسر ارتقار سے اجسام کے طبعی نشوونما (حیاتیات) ہی میں کام نہیں لیتا بلکہ بنی نوع انسان کے اخلاقی نشوونما (اخلاقیات) اور معاشروں کے ارتقار (اجتماعیات) میں استعمال کرتا ہے "ڈارون" کے تعقل ارتقار یعنی انواع میں باہمی امتیازات کے ساتھ ساتھ نشوو

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

یعنی اگر صرف مادیت کی طرف توجہ کی گئی اور اس کے ساتھ بلند تصورات اور اخلاقی اقدار کی تنظیم نہ ہوئی تو آگے چل کر وہ مادیت غیر مفید بلکہ تباہ کن بن جائے گی چنانچہ جو قومیں اپنے اندر چند اخلاقی تبدیلیاں پیدا کر کے ترقی کی راہوں سے شناسا ہوئیں اور پھر بعد میں اپنا سارا زور مادیت کی طرف لگا دیا بالآخر یہی مادیت ان کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی۔ تاریخ میں ایسی قوموں کے قیام و بقار کی مدت ان قوموں کے مقابلہ میں بہت کم ملتی ہے جنہوں نے دونوں کے ساتھ ساتھ ترقی کی منزلیں طے کیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مادیت کے ہر موڑ اور ہر موقف یعنی اس کو فراہم کرنے اس کو برقرار رکھنے اور اس کا مصرف متعین کرنے غرض ہر مقام پر اخلاقیت کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اسی بنار پر "شوقی" نے کہا ہے

وانما الاخلاق ما بقیت   فان هم ذهبت اخلاقهم ذهبوا

قومیں اس وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک ان میں اخلاق باقی رہیں اور جب اخلاق ختم ہو جاتے ہیں تو وہ قومیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح بلند تصورات اور اخلاقی اقدار کے ساتھ مادیت کا ارتقار نہ ہوتا رہا تو یہ مسلمہ بات ہے کہ اس سے نہ تو کوئی مضبوط اور پائدار کلچر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ باقی رہ سکتا ہے۔ بلکہ جب قومی زندگی کی ایسی شکل ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس میں اخلاقیات کی تنظیم نہ ہونے کو بہت دخل ہے ورنہ ٹھیک تنظیم کے بعد ناممکن ہے کہ صلاحیتیں مادیات کے نشو و ارتقار کی طرف نہ لگ جائیں۔

تاریخ میں ایسی قوموں کی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ جب ان سے قوت و طاقت سلطنت اور دولت چھن جانے کی وجہ سے مادی ارتقار کا سلسلہ ختم ہو گیا تو ان کا علم و تہذیب اور تمدن و شائستگی سب رخصت ہو گئے بلکہ رفتہ رفتہ وہ قومیں بھی ختم ہو گئیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ارتقار کو بھی تسلیم کرتا ہے بلکہ اس میں اور زیادہ وسعت اور عمومیت پیدا کرتا ہے اس طرح سے کہ ارتقار کو وہ ایک ایسا عمل سمجھتا ہے جس کی وجہ سے ہم جنس مختلف جنس ہو جاتے ہیں اور سادہ پیچیدہ ہو جاتے ہیں (اخلاقیات ص ۵)

اس بارے میں قرآن حکیم نے جو انتظامات کئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے ۔

اس سلسلہ میں قرآن حکیم کے انتظامات کی تفصیل

(۱) قومی و جماعتی زندگی میں اس نے چند اجتماعی و اخلاقی کمزوریوں کے دور کرنے پر اکتفا نہیں کیا جیسا کہ موجودہ دنیا کی قوموں اور تنظیموں کا حال ہے بلکہ اس نے ایمان کے ذریعہ ایک گہری اور ہمہ گیر تبدیلی پر زور دیا اور ساتھ ہی ساتھ تربیت کا باقاعدہ پروگرام پیش کیا۔

(۲) "عملِ صالح" کے مفہوم میں ایسے زندگی بخش اصولوں کی طرف اشارہ کیا کہ جن پر عمل کرنے سے نہ صرف یہ کہ تمدن کا نشو و ارتقاء ہوتا رہتا ہے بلکہ ان "جراثم" کی پیدائش پر بھی پابندی لگ جاتی ہے جو آگے چل کر تمدن کے دشمن ثابت ہوتے ہیں قرآن کی نظر میں ایمان اور عمل صالح کی اصطلاح بڑی زوردار اور جان دار ہے بدقسمتی سے ان کا اصل مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے انھیں بے جان بنا دیا ہے ۔ اگر ٹھیک ٹھیک ان کا قرآنی مفہوم واضح ہو جائے تو عروج و زوال کی بحث میں نہ قوموں کی تاریخ کھنگالنے کی ضرورت پڑے اور نہ "عمرانیات و اجتماعیات" کی کتابیں پڑھنے کی بلکہ قوموں کی موت و حیات کے بارے میں ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہمارے سامنے آجاتا ہے

(۳) "ایمان بالیوم الآخر" کے ذریعہ زاویۂ نگاہ میں بنیادی تبدیلی کا حکم دیا۔ اور جزا و سزا کا نظام پیش کر کے انسان کو اپنے اعمال و افعال کا ذمہ دار قرار دیا ۔ جواب دہی کا یہ قرآنی تصور انسان کو گوشۂ تنہائی میں بھی دشمن تمدن "جراثیم" کی پیدائش پر پابندی لگا دیتا ہے ۔

(۴) "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کو قومی زندگی کا نصب العین ٹھہرایا جس سے ایک طرف تو "معروف" کی پرورش اور نشو و نما ہو کر پورے ماحول پر معروف کا غلبہ ہو جاتا ہے اور دوسری طرف "منکر" پر قابو پانے کی جدوجہد برابر جاری رہتی ہے ۔ اس طرح رفتہ رفتہ تمام وہ چیزیں اکٹھا ہوتی رہتی ہیں جو تمدن کو پروان چڑھاتی ہیں اور وہ باتیں کم ہو جاتی ہیں جن سے تمدن کو نقصان پہنچتا ہے۔

اس سلسلہ کی چند آیتیں یہ ہیں ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا	بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے
وَالنَّصٰرٰی وَالصَّابِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ	اور نصاریٰ اور صابئین میں سے جو لوگ اللہ پر

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ	اور آخرت[2] کے دن پر ایمان لائے اور عمل صالح کئے
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ	تو ان کے رب کے پاس انھیں ضرور اجر ملے گا اور
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٢/٦٢	نہ انھیں کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔
كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی اصلاح اور درستی
تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ	کے لئے ظہور میں آئی ہے تم نیکی[4] کا حکم دینے والے
الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ٣/١٠٩	برائی[5] سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو

قوموں کی تنظیم کی دو شکلیں ہیں (۱) پہلی یہ کہ چند اجتماعی کمزوریاں دور کر کے کسی انقلاب کو "خوش آمدید" کہنے کے لئے انھیں تیار کر لیا جائے۔ (۲) اور دوسری یہ کہ ہر ہر فرد کی زندگی میں ایک گہری تبدیلی پیدا کی جائے ان کا زاویۂ نگاہ بدلا جائے اور زندگی کے ہر موڑ اور ہر موقف پر ان کی تربیت کی جاتی رہے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں تنظیموں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، پہلی صورت میں خرابیاں اور دشمنِ تمدن جراثیم جلد غلبہ پا جائیں گے جس کی بنا پر جلد ہی وہ قوم ترقی سے تنزل کی طرف آ جائے گی اور دوسری صورت میں اگر ٹھیک ٹھیک عمل درآمد ہوتا رہا تو خرابیوں کے غلبہ پانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اگر قومی زندگی کو سستی و کاہلی اور عیش پرستی نے گھیر لیا تو چونکہ اٹھان اس کی مضبوط تھی اس لئے ہلاکت و بربادی کے لئے ایک مدت درکار ہوگی[1]۔

---

[1] اس موقع پر ایک اور بات ذکر کر دینا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کسی قوم کے بارے میں یہ معلوم کرنا، اس کی ترقی کی داغ بیل کب سے پڑی ہے یا اس کے زوال کی ابتدا کب سے ہوئی ہے نہایت دشوار امر ہے۔

دراصل ابتدا میں کچھ ایسے محرکات پیدا ہوتے ہیں جو لاشعور میں اپنا اثر کرتے رہتے ہیں اور ظاہر بیں نظریں ان کے سمجھنے سے قاصر ہوتی ہیں یہ حالت زوال پذیر قوموں کے بارے میں چند در چند غلط فہمیوں کا موجب بنتی ہے ایک طرف ان کا ترقی یافتہ تمدن بھی موجود رہتا ہے اور دوسری طرف وہ جراثیم پیدا ہوتے رہتے ہیں جو تمدن کے دشمن ہیں۔

پسماندہ اور احساس کمتری میں مبتلا قومیں اس حالت سے بالعموم دھوکہ کھا کر ان کے تمدن کی ہر ہر چیز کی نقالی کرنے میں فخر سمجھتی ہیں جوں کہ ان پسماندہ قوموں میں اچھائیوں کے قبول کرنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے اور
(بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

قرآنِ حکیم نے دوسری قسم کی تنظیم کا حکم دیا ہے اور اس کے قیام و بقار کے لئے ایمان و عمل صالح کا جامع نظام پیش کر کے معاشرہ کے ارتقار کو ضروری قرار دیا ہے

ذیل میں چند آیتیں ذکر کی جاتی ہیں جن سے اخلاقیات کی اعلیٰ پیمانہ پر تنظیم اور مادیات کے ارتقار کا ثبوت ملتا ہے نیز ان دونوں کے مجموعہ سے معاشرتی ارتقار کی وضاحت ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں چند آیات قرآنی سے استشہاد	وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ	جہاں تک ہو سکے قوت و طاقت کے سامان پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لئے تیار رہو اس تیاری سے تم اپنے اور اللہ کے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھو گے اور ان لوگوں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں لیکن اللہ انھیں جانتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) برائیوں کے قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہو جاتی ہے جبھی تو وہ پسماندہ ہوتی ہیں اس لئے اس نقالی سے ان کے حصہ میں اچھائیاں کم اور برائیاں زیادہ آتی ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ کسی ترقی یافتہ تمدن کا اثر دوسری قوموں پر پڑنا ناگزیر ہے بلکہ ہر نیا تمدن بہت حد تک دوسری بہت سی قوموں اور تمدنوں کا خوشہ چیں ہوتا ہے اس لئے داعی انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خوشہ چینی کا ایک عجیب و غریب طریقہ ارشاد فرمایا ہے کہ جس پر عمل کر کے دوسروں کی اچھائیوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور برائیوں سے احتراز کیا جا سکتا ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام آپ نے یہ کیا کہ اچھائی اور برائی کا معیار مقرر کیا پھر ذہنی تبدیلی کے ذریعہ ہر اچھائی کو اپنانے اور قبول کرنے کا حکم دیا خواہ کہیں بھی پائی جائے اور ہر برائی سے بچنے کی تاکید کی خواہ کتنے ہی خوشنما پردوں میں لپیٹ کر آئے۔ اچھائیوں کے بارے میں آپ نے فرمایا

الكلمة الحكمة ضالة المؤمن فحيث وجدها فهو احق بها (الحديث)	ہر حکمت و اچھائی مومن کی گم شدہ چیز ہے جہاں کہیں پائے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔

اس میں بنیادی نکتہ یہ ہے اچھائی جب دوسرے سے کی جائے تو اپنی چیز سمجھ کر لی جائے نہ کہ دوسروں کی چیز سمجھ کر اس طریق سے ہر خوددار قوم دوسروں کی برائیاں لینے سے احتراز کرے گی کیوں کہ وہ اس کی نہ ہوں گی اس حدیث سے ہر ہر قدم پر دوسری قوم کی نقالی کرنے کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔

برائیوں کے بارے میں آپ نے فرمایا

من تشبه بقوم فهو منهم (الحديث)	جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انھیں میں سے سمجھا جائے گا۔

(بقیہ حاشیہ پر صفحہ آئندہ)

آیت میں بصیغۂ امر قومی زندگی کے ہر موقف اور ہر موڑ پر قوت وطاقت کے سامان سے لیس ہونے کا حکم دیا گیا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کوئی دور ایسا نہیں ہے کہ اس کشمکش حیات میں مادیت کے بغیر کام چل سکے۔

نیز "من قوۃ" کے لفظ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہست و بود کی دنیا میں مادی ارتقاء ضروری ہے اور اس ارتقاء کا ساتھ دیئے بغیر کوئی قوم اپنے کو باقی نہیں رکھ سکتی ہے۔ چنانچہ یہ لفظ اپنے وسیع اور جامع مفہوم کی بناء پر زمانہ کے تقاضا کے مطابق قوت وطاقت کے ہر ضروری سامان کو شامل ہے۔

اور "ما استطعتم" کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک تمہارے بس میں ہے اپنے مقدور کے مطابق قوت وطاقت کا سامان فراہم کر کے مزاحمت اور مدافعت کے لئے ہر وقت تیار رہو ایسا نہیں ہے کہ جب تک دنیا جہان کے ہتھیار اور سامانِ جنگ نہ مہیا ہو جائیں اس وقت تک برابر بے بسی کا عذر ہوتا رہے۔

پھر اس کے بعد کی چند آیتوں میں ایسے اخلاقی اوصاف کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو زندگی کو منظم کر کے اس میں حرکت وعمل پیدا کر دیتے ہیں مثلاً (۱) ایمان ویقین (۲) ایثار وقربانی (۳) تنظیم جماعت (۴) اعتماد وتوکل (۵) تائیدِ غیبی کی امید (۶) محبت ورحمت

جو لوگ قوموں اور جماعتوں کی "نفسیات" سے واقف ہیں وہ اس امر کو بخوبی جانتے ہیں کہ ان اوصاف کا اثر ان کی زندگی پر کتنا اور کس قدر پڑتا ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ	اے ایمان والو اللہ کے لئے مضبوطی سے قایم رہنے
لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ	والے اور انصاف سے گواہی دینے والے ہو جاؤ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اچھائی اور برائی کا معیار مقرر ہونے کے بعد کوئی باعزت قوم جس کے پاس تھوڑی سی بھی قومی حمیت اور غیرت باقی ہوگی وہ اس بات کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہ ہوگی کہ دوسری قوموں کی برائیاں اختیار کر کے اپنے دامن پر اس جیسا ہونے کا بدنما دھبہ لگائے اور اپنی ہلاکت کے لئے گڑھا کھود ے نفسیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ داعئ انقلاب ؐ نے ان دونوں حدیثوں میں کیا کچھ کہہ دیا ہے ۱۲

شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ۔ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ

کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کے لئے نہ آمادہ کرے کہ اس کے ساتھ بے انصافی کرو ہر حال میں انصاف کرو یہی تقویٰ سے لگتی بات ہے اور اللہ سے ڈرو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤی اَنْ تَعْدِلُوْا ۱۳۴/۴

اے ایمان والو مضبوطی کے ساتھ انصاف پر قائم رہنے والے اور خدا لگتی گواہی دینے والے ہو جاؤ اگرچہ یہ گواہی اپنے نفس یا ماں باپ اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو (جن کے خلاف گواہی دی جا رہی ہے) اگر ان میں کوئی مالدار یا محتاج ہے (تو تمہیں اس کی رعایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ) اللہ سب سے بڑھ کر ان کی پرداخت کرنے والا ہے (کہیں) ان کی خاطر تم اپنی خواہش کی اتباع کر کے حق و انصاف سے انحراف نہ کر جاؤ۔

یعنی اخلاق کی ایسے اعلیٰ پیمانہ پر تنظیم ہونی چاہیئے کہ اس کے نفاذ میں کسی گروہ کی دشمنی یا کسی عزیز سے عزیز ترین کی جانب داری حتی کہ اپنی ذات کی رعایت کو بھی دخل نہ ہو۔

قرآن حکیم نے عدالت پر سب سے زیادہ زور دیا ہے قومی زندگی کی روح رواں یہی خصلت ہے اور "اصلح" بننے کے لئے یہی معیار ہے"

قرآن حکیم میں "عدل" اور "عدالت" پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے اس لئے یہاں اس کی تشریح کر دینا چاہیئے تاکہ قومی زندگی میں اس کا مقام واضح ہو سکے نیز یہ بات معلوم ہو جائے کہ قوم کو اصلح بنانے میں اسے کس قدر دخل ہے۔

اس بارے میں دنیا کے چند مشہور مفکرین کے خیالات یہ ہیں۔

امام غزالیؒ نے "عدل" کو مجموعہ فضائل قرار دیتے ہوئے اس کی یہ تعریف کی ہے

"قوت عقلی اور قوت شہوانی کی ضروری ترتیب اور پھر اس ترتیب کے مطابق ان قوتوں کے وجود پذیر ہونے کا نام "عدل" ہے۔"

پھر کہتے ہیں۔

"عدل چوں کہ مجموعۂ فضائل کا نام ہے اس لئے فضائل کے تینوں اصول (عفت۔ حکمت۔ شجاعت) کے فروع خود عدل کے فروع ہیں"۔ [1]

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے عدالت کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

ھی ملکۃ فی النفس تصدر عنہا	"عدالت" ایک "ملکہ" کا نام ہے جس سے ایسے
الافعال التی یقام بھا نظام المدینۃ	اعمال وافعال صادر ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعہ
والحی بسھولۃ [2]	ملکی اور قومی انتظام بآسانی قیام پذیر ہوتے ہیں"۔

شاہ صاحب عدالت ایک ایسے "ملکہ" کو کہتے ہیں کہ اس کے حاصل ہونے کے بعد فکری و عملی دونوں قوتیں ٹھیک ٹھیک استعمال ہونے لگتی ہیں اور حقوق و فرائض کی ادائیگی میں سہولت ہوتی ہے۔

یعنی قومی زندگی کی جب ایسی تنظیم ہو کہ ہر شے اپنے محل اور اپنی حدود کے اندر ہو اور ہر شخص اپنا حق پائے اور بغیر کسی کمی کے دوسرے کا حق ادا کرے تو وہ عادل قوم کہی جائے گی۔

قومی اور جماعتی عدل میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ہر فرد عدل کے قائم کرنے میں اپنی ڈیوٹی پوری کرے اور عدل کو بروئے کار لانے کے لئے جن جن اعمال و افعال کی ضرورت ہے ہر فرد اپنی طاقت بھر انھیں انجام دے۔

یورپ کے چند ماہرین اخلاق کے اقوال عدالت کے بارے میں یہ ہیں۔

آر۔ اے۔ پی۔ رو جرس کہتے ہیں

"چار فضائل اصلیہ حکمت۔ شجاعت۔ اعتدال اور عدالت میں عدالت سب سے بلند پایہ ہے یہ تمام فضائل کا اتمام اور سرتاج ہے کیوں کہ اگر یہ نہ ہو تو باقی اپنی غایت کو کھو بیٹھیں"۔ [3]

افلاطون نے عدالت کی یہ تعریف کی ہے۔

---

[1] احیاء العلوم جلد ۳ ص ۱۷۲ از اخلاق و فلسفۂ اخلاق ص ۲۰۵ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۹۵ [3] تاریخ اخلاق ص ۳۳

"ہر شخص اپنا کام کرے اور دوسرے کے کام میں دخل نہ دے"

عدالت کا اصلی جوہر روحانی و داخلی ہے[1]

ظاہر ہے کہ یہ صورت اسی وقت ممکن ہے جب کہ معاشرہ کی اعلیٰ پیمانہ پر تنظیم ہو۔

پروفیسر جان ڈیوی اور پروفیسر جمیس ایچ ٹفٹس کہتے ہیں عدالت کے تین معنیٰ ہیں

(۱) عدالت کا لفظ جب بہت ہی وسیع معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد صداقت شعاری۔ درست کرداری اور راست بازی ہوتی ہے اس مفہوم کے لحاظ سے عدالت اخلاق کا ماحصل ہے یہ نیکی کی ایک قسم نہیں ہے بلکہ عین نیکی ہے عادلانہ فعل ہی واجب العمل فعل ہے۔

(۲) یہی شے انصاف پسندی، دادگری، ناطرفداری اور دیانت داری کی شکل اختیار کرلیتی ہے

(۳) عدالت کے سب سے محدود معنیٰ وہ ہیں جن کی رو سے عدالت اور قانون کے ذریعے حقوق کی حمایت ہوتی ہے۔

ارسطو کے زمانہ سے (اور اس کے تتبع میں) آخرالذکر عدالت کی دو قسمیں کی جاتی ہیں (۱) توزیعی۔ یہ ہر ایک کو بقدر استحقاق عزت و دولت وغیرہ دیتی ہے۔ (۲) اصلاحی۔ یہ مکافات اور تلافی کے ذریعہ حدود قانون سے تجاوز کرنے والوں کے مقابلہ میں قانون کی حمایت کرتی ہے اور اس طرح قانون کی عظمت کو برقرار رکھتی ہے[2]

ان تفصیلات کے پیش نظر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عدالت اور عدل کے مفہوم کی وسعت اور گہرائی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوتے ہے۔ قومی اور جماعتی زندگی کی روح رواں یہی خصلت ہے دنیا کی جو قوم جس قدر اس خصلت کو اپنائے گی اسی لحاظ سے وہ دوسروں کے مقابلے میں "اصلح" قرار دی جائے گی۔

انسانی فطرت سے معاشرہ کے ارتقاء اور اخلاقیت و مادیت دونوں کی ضرورت پر استشہاد

غور سے دیکھا جائے تو انسان اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے کسی ایک حالت یا ایک درجہ پر قناعت نہیں کرسکتا بلکہ اس کے سامنے ترقی کی غیر محدود شاہراہیں ہونا ضروری ہیں۔ اور یہ شاہراہیں

---

[1] تاریخ اخلاق ص۳۳ [2] اخلاقیات حصہ دوم باب ۱۹ ص۳۲۲

اخلاقیت اور مادیت دونوں گوشوں میں ہونی چاہئیں ورنہ وہ اپنی "تشنگی" بجھانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

اس کی صراحت جس طرح دنیا کے حالات کا جائزہ لینے سے ہوتی ہے کہ مادی عروج کے کمال پر پہنچ جانے کے باوجود سسکتی ہوئی انسانیت اور بلکتی ہوئی روحانیت کی تسکین کے لئے کوئی سامان نہیں ہے۔ سے

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

اسی طرح اس نظریہ سے بھی ہوتی ہے جو انسان کے بارے میں قرآن حکیم نے پیش کیا ہے انسان قرآنِ حکیم کی نظر میں کسی حیوان کی ترقی یافتہ شکل نہیں ہے بلکہ وہ ایک مستقل مخلوق ہے جہاں حیوانیت کا درجہ ختم ہو کر مافوق حیوانیت کا درجہ شروع ہوتا ہے۔

ایسے ہی وہ "جواہر" جو انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرنے والے ہیں اور اس کے اندر خلافت اور نیابت کی شان پیدا کرنے والے ہیں وہ نہ تو کسی مخلوق کے عطا کردہ ہیں اور نہ ہی کسی تدریج ترقی کا نتیجہ ہیں جیسا کہ ڈاروِن وغیرہ کا خیال ہے بلکہ وہ دراصل صفاتِ الٰہی کا "پرتو" اور "خلقتِ بدیٰ" کا نتیجہ ہیں۔

اسی بنا پر قرآنِ حکیم نے ایک موقع پر "جوہرِ انسانیت" کو خدائی روح پھونک دینے سے تعبیر کیا ہے اور بے شمار جگہ تسخیرِ کائنات کی طرف توجہ دلا کر معاشرہ کے ارتقار کی راہیں کھولی ہیں۔

ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۳۲/۹	پھر اللہ نے انسان کو درست کیا اور اس میں اپنی روح سے (کچھ) پھونک دیا اور تمہارے لئے کان آنکھ اور دل بنایا۔

اس جوہر کے بعد ہی انسان تمام تر شرافت و فضیلت کا مستحق ٹھہرا ہے اور بے شمار تنظیمی و تخلیقی

صلاحیتوں کا مالک ہوا ہے

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ۱۵/۲۸

پھر جب میں انسان کو درست کردوں اور اس میں اپنی روح سے (کچھ) پھونک دوں تو تم (فرشتے) اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑو۔

جس کے بنانے میں خداوند تعالیٰ کا (اس کے حال اور شان کے مطابق) دست مبارک مصروف عمل ہوا ہو ظاہر ہے کہ اس کی وسعتوں اور بلندیوں کا کیا مقام ہوگا اور کس قدر صلاحیتیں اس کے اندر ودیعت کی گئی ہوں گی۔

ایک موقع پر اس امتیازی شان کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۷۵/۳۸

(اے ابلیس) جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اس کو سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے روکا ہے

اس سلسلہ کی ایک حدیث نقل کرتا ہوں جس کے مفہوم پر غور فرمائیے۔

عن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لما خلق اللہ آدم وذریتہ قالت الملائکۃ یا رب خلقتھم یاکلون ویشربون وینکحون ویرکبون فاجعل لھم الدنیا ولنا الآخرۃ قال اللہ لا اجعل من خلقتہ بیدی ونفخت فیہ من روحی کمن قلت لہ کن فکان

(شعب الایمان مشکوٰۃ)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ جب اللہ نے آدمؑ اور ان کی ذریت کو پیدا کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار آپ نے ان لوگوں کو ایسا بنایا کہ وہ کھاتے پیتے ہیں نکاح کرتے ہیں (دنیوی اوصاف سے متصف ہیں) اس لئے آپ دنیا کو ان کے حصہ میں کردیجئے اور آخرت کو ہمارے حصہ میں کردیجئے حق تعالیٰ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جس مخلوق کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور جس میں اپنی روح سے (کچھ) پھونکا اس مخلوق کو میں ان کے برابر نہ کردوں گا

جن کو میں نے لفظ "کن" سے پیدا کیا ہے

ظاہر ہے کہ ایسی مخلوق کے بارے میں یہ سوچنا بھی گناہ ہے کہ وہ کسی ایک حالت یا درجہ پر قناعت کرکے معاشرہ کے ارتقار کی نئی راہیں نہ ڈھونڈے گی۔

دراصل نیابتِ الٰہی کا تصور ہی زندگی کے لئے ایک ایسا نصب العین بہم پہنچاتا ہے کہ انسان کو پرواز کرنے کے لئے اس سے بلندتر کوئی نصب العین نہیں ہوسکتا ہے نہ اخلاقی دنیا میں اور نہ مادی دنیا میں۔

بھلا ایسی صورت میں کون باور کرے گا کہ مادیت یا اخلاقیت کے بغیر کوئی قوم حقیقی و دائمی زندگی حاصل کرسکتی ہے یہ تو اسی حالت میں ممکن ہے جب کہ ایک طرف اخلاق کی اعلیٰ پیمانہ پر تنظیم ہو اور دوسری طرف مادیات کا ارتقار ہوتا رہے اور پھر یہ دونوں مل کر معاشرہ کے ارتقار کا موجب بنیں۔

(باقی آئندہ)

العلم والعلماء

یہ جلیل القدر امام حدیث علامہ ابن عبدالبر کی شہرۂ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت صاف اور شگفتہ ترجمہ ہے، مترجم کتاب مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی اس دور کے بے مثال ادیب اور مترجم سمجھے جاتے ہیں، موصوف نے یہ ترجمہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا تھا جو اب ندوۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے علم اور فضیلتِ علم کے بیان، اہلِ علم کی عظمت اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل پر خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے آج تک کوئی کتاب اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی، اس متبرک کتاب کی ایک ایک سطر سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق ہے، ایک زبردست محدث کی کتاب اور ملیح آبادی صاحب کا ترجمہ موعظتوں اور نصیحتوں کے اس عظیم الشان دفتر کو ایک دفعہ ضرور پڑھئے۔ صفحات ۳۰۰، بڑی تقطیع قیمت چار روپے آٹھ آنے مجلد پانچ روپے آٹھ آنے۔